ترکمانستان، کرغیزستان، قازقستان، آذربائیجان اور پھر کوہ قاف کے علاقوں (چیچنیا اور داغستان) اور روسی فیڈریشن میں شامل تاتارستان وغیرہ ایک بار پھر اسلامی دنیا کا حصّہ بنیں گے''۔

لیکن اشتراکی روس کے حلقہ بگوش حلقے، جن میں پاکستانی کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے علاوہ صوبہ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے نام نہاد قوم پرست بھی شامل تھے، ہمارے اس یقین کو زعمِ باطل سمجھتے تھے اور ہمارا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا کرتے تھے: ''ان علاقوں کو بھول جاؤ۔ وہاں اب مسلمان نہیں بلکہ سویٹ انسان بستے ہیں، جنھوں نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ تاریخ کا پہیہ پیچھے کی طرف کبھی نہیں گھومے گا۔ یہ اب آگے کی طرف ہی گھومے گا اور اشتراکی تحریک وسط ایشیا سے افغانستان کے راستے پاکستان کا رُخ کرے گی''۔

تاہم، اسلام نے وسطِ ایشیا کے تمدن پر اتنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں کہ ۷۰ سال تک جبر کے تمام ہتھکنڈوں کے باوجود، اشتراکی روس کے ٹوٹتے ہی اسلامی تہذیب ان علاقوں میں نمودار ہونے لگی اور استعماری طاقتوں کو تشویش لاحق ہوگئی کہ مشرقی یورپ سے مشرقی ترکستان تک پھیلا ہوا ترک مسلمانوں کا وسیع و عریض خطہ اگر پھر اسلامی دنیا کے ساتھ ہم آغوش ہوگیا، تو اس نئی سپر طاقت کا مقابلہ کیوں کر ممکن ہوگا۔

اگرچہ اس وقت ظاہر بین نظروں کو یہ دیوانے کی بڑ معلوم ہوتی ہے، لیکن آج سے ۳۰، ۳۵ سال قبل سوویت یونین کی پسپائی بھی اسی طرح ناممکن نظر آتی تھی۔ ایک صاحبِ ایمان کا وجدان، جن ممکنات کو دیکھ سکتا ہے وہ ایک منافق اور کافر کی نظر سے اوجھل ہوتے ہیں۔ علّامہ اقبالؒ کو یہ انقلاب ۷۰ سال پہلے نظر آرہا تھا، جب انھوں نے کہا تھا ؎

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیرِ افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

(وہ انقلاب جو آسمانوں کے ضمیر میں نہیں سما سکتا، میں اسے دیکھ رہا ہوں اور کچھ نہیں جانتا کہ کیسے دیکھ رہا ہوں۔)

مولانا سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھتے ہوئے یہی خواب دیکھا تھا کہ ان شاء اللہ اسلام کی احیا کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کو واشنگٹن اور کمیونزم کو ماسکو

میں پناہ نہیں ملے گی۔

آج سے تقریباً ۱۰۰ سال قبل جب دنیا کی استعماری طاقتیں یورپ کے مرد بیمار (عثمانی سلطنت) کی آخری رسومات ادا کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں اور عثمانی خلافت کا خاتمہ کر کے وہ سمجھنے لگی تھیں کہ انھوں نے مصطفےٰ کمال کے ذریعے اسلامی خلافت کے بجاے سیکولرزم کو ترکی کے دستور کی بنیاد بنا دیا ہے تو علامہ محمد اقبال نے مصطفےٰ کمال کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

لادینی و لاطینی کس پیچ میں اُلجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا لاغالب الا ھو

مصطفےٰ کمال نے یہ سمجھا تھا کہ بڑی تعداد میں علما کو قتل کر کے اور عربی رسم الخط کو لاطینی رسم الخط میں تبدیل کر کے اور اسلام کے بجاے سیکولرزم اور لادینیت کو ملکی دستور کی بنیاد قرار دینے سے، وہ ترک قوم کا رشتہ اپنے شان دار ماضی سے کاٹنے میں کامیاب ہوجائے گا اور اسے یورپ کا ایک ملک بنا دے گا لیکن حیف کہ اس کی نظر ترک قوم کے ضمیر میں گندھی ہوئی اسلامی اقدار تک نہ پہنچ سکی۔ ترکی میں اسلامی قوتوں نے اس بدلی ہوئی صورتِ حال میں جبر و استبداد کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی حکمت عملی اپنائی۔

علامہ بدیع الزماں سعید نورسی [۱۸۷۷ء-۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء] کی نوری تحریک اس جوابی حکمتِ عملی میں پیش پیش تھی۔ نوری رسائل کے ذریعے انھوں نے اپنا پیغام خاموشی سے پھیلانا شروع کیا۔ اسلام کے ساتھ محبت رکھنے والے ترک اس کے حلقہ بگوش ہوگئے اور سینہ بہ سینہ ان کے پیغام کو پھیلاتے رہے۔ ان کے پیش نظر کوئی فوری تبدیلی یا انقلاب نہیں تھا، بلکہ وہ اسلامی تہذیب اور اسلامی فکر کو بچانے کا ایک ۵۰ سالہ منصوبہ لے کر خاموشی سے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے اور اب یہ خاموش لہریں جنھیں مغربی دنیا Creeping Islam (یعنی رینگتا ہوا اسلام) کہتی ہے، دنیا کی توجہ کا مرکز بنتی دکھائی دے رہی ہیں ع

آسماں ہوگا سحر کے نُور سے آئینہ پوش

تشدد کے اسباب اور حل

راشد غنوشی ○ / ترجمہ: ضمیر الحسن خان فلاحی

تشدد اور انتہا پسندی ایک ایسا مظہر ہے جس سے آج کوئی دین اور نظریہ مستثنیٰ نہیں ہے، مگر تشدد کی بھیانک شکل، جس میں پورا انسانی معاشرہ آج جھلس رہا ہے، وہ ہے جو حکومتی سطح پر جاری ہے۔ خواہ یہ عائلی تشدد ہو، کمزوروں کے استحصال پر مبنی اقتصادی حالات ہوں، قبائلی شناخت کے قبیل سے ہو یا فساد اور آمریت کے پیش نظر فوجی آپریشن۔

انسانی روابط میں تشدد کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جن سے کوئی انسانی معاشرہ مستثنیٰ نہیں ہے۔ گویا کہ تشدد کا عنصر ہر فرد اور معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انفرادی سطح پر ہر فرد کے اندر بدلہ، انتقام یا غیر قانونی طور پر اپنی اس فطری پیاس بجھانے کے محرکات موجود ہوتے ہیں یا پھر اجتماعی، سیاسی، مذہبی اور اقتصادی عوامل کے تحت پائے جاتے ہیں۔

تشدد کے انفرادی ازالے کے لیے انسان نے حکومتوں کی تشکیل کا طریقہ ایجاد کیا تاکہ ایک دوسرے کو اس کی اذیت سے نجات دلائی جاسکے۔ قانون، محکمے اور حفاظتی خدمات کے ادارے اسی کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر ظلم، تشدد اور حملوں کو روکنے کے لیے عسکری نظام قائم کیا گیا۔ حکومتی سطح پر بین الاقوامی ادارے، کونسلیں اور تنظیمیں وجود میں آئیں، تاکہ وہ ممالک کے درمیان منصف کا کردار ادا کریں۔

ان تمام سرگرمیوں کا وجود اس بات کا واضح اور بیّن ثبوت ہے کہ ظلم و تشدد کے رجحانات انسانی

○ سربراہ، حرکتِ اسلامی النہضۃ، تیونس

فطرت کا خاصا ہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ: ''ہر انسان (ابن آدم) خطا کار و غلط کار ہے''۔

مزید برآں انسانی فطرت میں پائے جانے والے یہ جارحانہ رجحانات و میلانات یا تو ایسے معتقدات، تہذیب، ثقافت، انداز تربیت اور ماحول سے غذا پاتے ہیں، جو عدل و احسان کی اعلیٰ قدروں کو پامال کرتے ہوئے ان رجحانات کو پروان چڑھاتے ہیں۔ یا پھر ایسے تصورات اور اقدار کو جنم دیتے ہیں کہ انسانی معاشرہ سنگ دل ہو جاتا ہے، اتنا سنگ دل کہ اس کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ جاتی۔ پھر وہ انسانوں کو تشدد اور جارحیت پر آمادہ کرتا ہے اور انسانی نفوس میں اس قدر غضب کی آگ بھڑکا دیتا ہے کہ وہ شرفِ انسانیت سے بہت نیچے، انتہائی پستی میں جا گرتے ہیں۔

سیاسی تشدد

یہاں ہم جس 'تشدد' اور 'انتہا پسندی' کی بات کر رہے ہیں، وہ محض انفرادی نہیں ہے اور نہ مطلق اجتماعی تشدد ہے، جو اپنے تسکین نفس کی خاطر ظلم و جبر کو جنم دیتا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ تشدد ہے، جو آج پوری مسلم اور غیر مسلم دنیا میں جاری و ساری ہے اور وہ ہے سیاسی تشدد۔

سیاسی تشدد دراصل 'تشدد' کی وہ خاص قسم ہے، جو بدقسمتی سے ان معاشروں میں بھی در آئی ہے، جو اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ ماضی میں تشدد کا یہ ہتھیار قوم پرستوں، بائیں بازو کی جماعتوں اور ان لوگوں کا شعار تھا، جو استعماریت سے برپا معرکے میں کردار ادا کر رہے تھے۔ بہرحال، آج جب 'تشدد' کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہی یک رخا تشدد ہوتا ہے جو دائیں طرف [اسلام پسندوں کی طرف] مڑ کر کبھی ان [مغربی] طاقتوں کی طرف نہیں دیکھتا جو پانی، ہوا اور حکومتی اداروں تک پر قابض ہیں، جو انسانوں کا سیاسی، سماجی اور معاشی مقاطعہ (بائیکاٹ) کرتی ہیں۔ یہ ان مظلوم قوموں پر ہر وقت دھمکی سے سونتی تلوار اُٹھائے رہتی ہیں، اسے کبھی میان میں نہیں کرتیں، جیسا کہ اقوام متحدہ، اس کے حلیفوں اور اس کے پروردہ اسرائیل کا معمول ہے، اور پھر اس کی سرپرستی کے لیے سلامتی کونسل کا سہارا۔

کتنا سنگین منظر ہے کہ یہ استعماری طاقتیں مڑ کر ان کی طرف نہیں دیکھتیں جن کو انھوں نے تختۂ مشق بنایا ہوا ہے۔ وہ انھیں یکسر نیست و نابود کرنے کے درپے ہیں، انھیں تعذیب کا نشانہ

بنائے ہوئے ہیں، ان کے منہ پر تالے اور کانوں پر پہرے بٹھائے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ جب یہ مظلوم، عصرِ حاضر کی زبان میں جمہوریت، دستور اور انتخابات کی بات کرتے ہیں، تو اس کے باوجود انھیں خلافِ قانون (ban) قرار دے ڈالتے ہیں۔ یہ سب تشدد کی مختلف شکلیں ہی ہیں۔ مگر آج کی تاریخ میں یہ تشدد کا ہدف نہیں ہیں بلکہ اس کا اصل ہدف اسلامی تحریکیں ہیں جنھیں انسانیت سوز فکروعمل کا علَم بردار قرار دیا جاتا ہے، جب کہ وہ ظالم استعمار اپنے آپ کو 'امن و آشتی' کا داعی اور علَم بردار قرار دیتا اور اپنی اس مشکوک حیثیت کو زبردستی تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ مسلمان معاشروں میں ان مسلح گروپوں کے وجود میں آنے کے اسباب وعوامل کیا ہیں اور انھیں ان کی انتہاپسندانہ سرگرمیوں سے باز رکھنے کی تدابیر کیا ہوسکتی ہیں؟

مسلم تاریخ کے صفحات ایسی جماعتوں کے ذکر سے بالکلیہ خالی نہیں ہیں، جو منکر کے ازالے کے لیے اسلحے کے استعمال کو ناگزیر سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ اس طرح کی جماعت یا مملکت جو اسلامی تاریخ میں مسلح بغاوت کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے، اس بغاوت یا سرکشی کے نتیجے میں ظلم و جَور کے بل پر ایک ریاست کو ختم کرکے اس کی جگہ دوسری ریاست ہی قائم ہوئی، اور پہلے سے قائم عدل وقسط کو ختم کرنے کا ذریعہ بنی۔

اسلامی اسکالروں نے کمال بیداری سے، ہمیشہ تشدد کے دروازے بند کیے ہیں کہ اس کی وجہ سے مسلمان معاشرے فتنے سے دوچار ہوتے ہیں اور انجامِ کار ان کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ چنانچہ ہر اس حالت کو 'فتنہ' سے تعبیر کیا گیا جس سے اسلام نے روکا ہے اور اس بات کی تلقین کی گئی کہ پُرامن طریقے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا جائے۔ لہٰذا، جب بھی مسلح خروج کی نوبت پیش آئی تو اہلِ علم نے اس کا التزام کیا اور دیگر اہل اسلام کو بھی اس کی دعوت دی کہ امن، توازن اور عدل کا راستہ اختیار کیا جائے۔

بلاشبہہ ہماری تاریخ میں ایسی جماعتوں کا ظہور جو قوتِ بازو پر بھروسا کرتی رہی ہیں، کوئی نادر و نایاب چیز نہیں ہے۔ اسلامی فکر اور مسلم تاریخ میں ایسے اصول ومبادی بھی موجود ہیں جو جابر اور ظالم سلطان کے مقابلے کے لیے جہاد کو مباح قرار دیتے ہیں۔ ہماری امت نے بھی حکمرانی و جہاں بانی کے تجربے کیے ہیں اور یہاں پر بھی ظلم وجَور دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردگرد پھیلی

ناپسندیدگی بھی قوموں کو متحد کرنے کا ذریعہ بنتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ اس اتحاد کو جب اُبھار کا موقع ملتا ہے تو وہ پھٹ پڑتا ہے اور اسلام، وطنیت اور انقلاب کے نام پر تشدد پر اُتر آتا ہے، حالاں کہ یہ صورتِ حال اور نتیجہ سراسر سیاسی چلن ہے جس کا تعلق ایک سیاسی منظرنامے کے ردعمل سے ہے۔

آج چونکہ اسلامی ثقافت مغلوب و مقہور ہے، اس لیے 'تشدد' بھی اسلام کا نام استعمال کر رہا ہے۔ وہ قرآن وسنت اور اسلامی فکر کا سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور بہرحال ان مظالم کا مقابلہ کرتا ہے جو فی الواقع اور تسلسل کے ساتھ ان پر روا رکھے جا رہے ہیں، مگر اس کے ساتھ یہ جوابی ردعمل ظلم کی نئی صورتوں کو بھی پیدا کرنے کا حوالہ بنتا دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ریاستیں جو اپنے حریف کی ہر آواز کو دباتی ہیں، ان پر معاشی پابندیاں عائد کرتی ہیں، ان کے درمیان فواحش کو فروغ دیتی ہیں اور تحقیر و تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں، جیسا کہ فلسطین میں مسلط کردہ تشدد ہے۔ جس طرح صیہونیت اور اس کے حامی امریکا کے ہاتھوں وہاں کی آبادیوں کو اُجاڑا جا رہا ہے۔ اس پر کیوں دل نہیں پسیجتے؟ پھر ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار مسلم آبادی کے وہ خطہ ہاے زمین ہیں کہ جہاں انقلابی تحریکات اٹھتی ہیں اور جواب میں انھیں کچلنے کی ہر ممکن بلکہ بدترین کوشش کی جاتی ہے۔

اسلامی تحریکات اور تشدد

سیاسی یا مسلح تشدد جسے اسلامی تحریکات سے منسوب کیا جا رہا ہے، مناسب ہوگا کہ اس کی حقیقت بھی دیکھ لی جائے۔

اسلامی گروہوں کے تشدد کی ایک صورت تو وہ مقابلہ ہے جو فلسطین، عراق، چیچنیا، کشمیر، فلپائن اور ترکستان جیسے ممالک میں جاری تسلط کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مسلح جدوجہد کے دینی و قانونی لحاظ سے جائز ہونے میں دو رائے نہیں ہوسکتیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس طرح کی فسطائیت و سامراجیت کا مقابلہ ہر مظلوم شخص کا فطری حق ہے کہ اصولی بنیادوں کے مطابق ہر شخص پہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت فرض ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ: ''جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے'' (متفق علیہ)۔ اختلاف صرف اس امر میں ہوسکتا ہے کہ اس صورت حال کی مدت اور شرائط کیا ہوں کہ جس میں غصب کیا ہوا حق واپس لیا جاسکے۔

بالعموم، اس طرح کی صورت حال میں جہاد نفع بخش اور باثمر ہوتا ہے۔ چونکہ ان علاقوں سے ظالم افواج کا انخلا ضروری ہے، جو انیسویں صدی میں عالم اسلام کے ایک بڑے حصّے پر ناحق قابض ہوگئیں۔ انھوں نے اپنے تسلط کو مستحکم کیا اور وہاں رہنے والوں کے لیے محدود علاقے کے سوا کوئی علاقہ سانس لینے کے لیے باقی نہیں چھوڑا، جس میں آج وہ دشمن کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جل نہ رہا ہو۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے کہ وہ جواب دیں۔ کل تک جو فوجیں شکست کا تصور بھی ذہن میں نہیں لاسکتی تھیں، مجاہدین نے ان کا تعاقب کیا ہے۔ یہ مظلوم اور بے نوا آج اپنے وطن کے دفاع اور اپنے گھروں کے انہدام کو روکنے کے لیے خود فوج بن گئے ہیں اور یہ عین تقاضاے فطرت ہے۔

مسلمانوں کے تشدد کی دوسری شکل وہ جہاد ہے، جو وہ فسطائی اور ظالم حکومتوں کے خلاف کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان آمروں کے ریاستی دساتیر اسلام سے منسوب ہیں، لیکن وہاں کے حاکموں کا اندازِ حکمرانی اسلامی اقدار، اسلام کے نظام عدل و انصاف کے لحاظ سے یک سر ناانصافی اور ظلم و زیادتی پر مشتمل ہے، اور سرکشی اور تشدد کے نہ ختم ہونے والے سلسلے سے جڑا ہوا ہے۔ وہاں گھٹن کی شدت کے نتیجے میں اسلامی جماعتوں کے کچھ گروہوں نے امن کا راستہ ترک کر کے اس راہ میں جو قربانیاں پیش کی ہیں، ان کا ماحصل تھوڑا اور اتفاقیہ ہے۔ اکثر ان جماعتوں کے ذمہ دار رہنما بنیادی اصلاحات پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں، اور انھیں اپنے طریق کار کی گمراہی کے اعتراف پر مجبور کرتے ہیں (جو فی الواقع ہے)۔ اس غور و فکر کی اساس فقہ پر نہیں ہے۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اس اُمید پر باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا جاتا کہ شاید آیندہ اس کے بہتر نتائج برآمد ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی آزادی اور حقوق فطری ہوتے ہیں۔ وہ کسی سے رعایت، تحفے یا عطیے کے طور پر نہیں ملتے۔ بدقسمتی سے انھی حقوق کو تشدد اور جبر کے ذریعے سلب کیا گیا ہوتا ہے۔ جس کا تجربہ اور مشاہدہ ہمارے سامنے ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور شہداے حق کے سلسلے میں وارد نصوص، امت اسلامیہ اور دیگر کے تجربات اس پر مزید اضافہ ہیں۔ انقلاب ایران ۲۰ویں صدی میں پُرامن انقلاب کی بہت بڑی مثال ہے، جس نے دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہیت اور خطے کی عظیم ترین فوج کا خاتمہ

کر کے اس کی جگہ دوسرا نظام قائم کیا، اور ملک کو ہر میدان میں اور ہر لحاظ سے ترقی دی اور اسے تبدیل کیا۔ فلسطین کی تحریک حریت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ یقیناً کامیابی سے ہم کنار ہوگی اور جدید اسلحے یا ٹکنالوجی سے لیس صیہونی وجود ختم ہو کر رہے گا۔

عوامی تحریک

سیاسی انقلابات کے حوالے سے عالمی منظرنامے پر عوامی تحریک، ایک اہم تحریک تصور کی جاتی ہے، جو گذشتہ صدی کے آخری عشرے میں وجود میں آئی اور جس نے اشتراکی روس اور شمالی یورپ میں کمیونزم کی تاناشاہی کا خاتمہ کیا۔ اس سے پیش تر اس طرح کی تحریکات پولینڈ، رومانیہ، چیکوسلواکیہ اور چلّی وغیرہ میں بھی وجود میں آچکی تھیں۔ آخری برسوں میں عوامی تحریک نے سلاوی آمر کو ختم کیا۔ اسی طرح تاجکستان، جارجیا اور قازقستان وغیرہ اس تحریک کے زیر اثر ہیں۔

ممکن ہے کہ سہولت پسند ان کھلی کامرانیوں پر ہماری کس مپرسی کے سبب یہ عذر پیش کریں کہ یہ: ''مغربی اقوام تھیں اور روشن فکر ان کی ضرورت تھی مگر دینی فکر جو خواتین پر پابندیاں عائد کرتی ہے اور انھیں عوامی تحریک میں شمولیت کی اجازت نہیں دیتی، وہ اقوام جواب نہیں دے سکتیں''۔ ہمارے نزدیک یہ عذر مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ حماقت اور نفاق پھیلانے کی دلیل ہے۔

اس کا بھی امکان ہے کہ دوسرے لوگ عالم عرب کے سکون اور جمہوریت مخالف مزاج کو بہانہ بنائیں کہ اس وجہ سے اُمت پچھڑی ہوئی ہے، جب کہ پوری دنیا میں جمہوریت کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ بہرحال ہمارے ملکوں میں بظاہر آمر کامیاب دکھائی دیتے ہیں، جس کے لیے وہ انتخابات میں دھاندلی کے سہارے لیتے ہیں، جو کسی سے مخفی نہیں۔

یہاں دو بڑی اور اہم قوتوں کے باہمی تعلق پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔ بڑی جماعتیں ہیں: اسلام پسند اور سیکولر۔ سیکولرزم وہ تنہا حزب ہے جو عوام کو اپنا گرویدہ بنا کر اپنے گرد جمع کرتی آئی ہے۔ وہ انھیں حکومت کے احترام پر مجبور کرتی ہے اور عالم انسانیت کو یہ پیغام دیتی ہے کہ: ''آپ جمہوری تبدیلی کے لیے ہمارا ساتھ دیں۔ یہی وہ واحد صورت ہے جس کے آگے مغرب ہتھیار ڈال سکتا ہے اور اس پر اتمام حجت کیا جاسکتا ہے''۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس گروہ نے طویل عرصے تک حکمرانی کا وہ بدترین نمونہ پیش کیا ہے، جسے ظلم کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔